Faith and Discovery
January – June 2026 Vol:4, Issue:1
ISSN(p): 3007-0643
ISSN(e): 3007-0651

علامہ اقبال کے نظریۂ فن کے فکری و جمالیاتی ابعاد

The Intellectual and Aesthetic Aspects of Allama Iqbal's Theory of Art

ستار خٹک

Abstract

This study examines Allama Muhammad Iqbal's theory of art with particular reference to its philosophical, aesthetic, ethical, and spiritual dimensions. The article explores Iqbal's conception of art as a dynamic and life-affirming force rather than a mere source of entertainment or aesthetic pleasure. It highlights his rejection of the doctrine of "Art for Art's Sake" and his advocacy of a purposive and constructive view of artistic creation. According to Iqbal, genuine art is rooted in spiritual insight, creative imagination, sincerity of feeling, and the strengthening of the human self (Khudi). The study further analyzes Iqbal's emphasis on the role of art in awakening human consciousness, inspiring moral and social transformation, and fostering individual as well as collective development. The article demonstrates that Iqbal regards artistic creativity as a manifestation of divine endowment and human participation in the process of creation. He associates true art with the ideals of freedom, self-realization, innovation, and the pursuit of higher purposes in life. Furthermore, the study investigates Iqbal's critique of

imitation, intellectual stagnation, and slavish mentality, which, in his view, deprive art of its vitality and transformative power. Through an analysis of selected poetic and prose texts, the article establishes that Iqbal's theory of art is fundamentally linked with his broader philosophy of life, selfhood, and civilization. It concludes that, for Iqbal, art is not an autonomous activity divorced from life; rather, it is a powerful instrument for spiritual awakening, ethical refinement, cultural reconstruction, and the realization of humanity's creative potential.

Keywords

Allama Iqbal; Theory of Art; Aesthetics; Khudi (Selfhood); Art for Life; Creative Evolution; Spirituality; Purposeful Art; Islamic Aesthetics; Moral Consciousness; Creative Imagination; Human Development; Civilization; Freedom and Creativity.

اقبال کا نظریۂ فن

علامہ محمد اقبال نے اپنے نظریۂ فن کے بارے میں مختلف مقامات پر نہایت واضح، مربوط اور مدلل انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے فنی افکار نہ مبہم ہیں اور نہ منتشر، بلکہ ایک منظم فکری نظام کی صورت میں سامنے آتے ہیں (نارنگ، ۱۹۸۳، ص. ۱۶۴)۔ اقبال نے فن اور جمالیات کے مباحث کو دلکش، حسین اور مؤثر پیرایۂ اظہار میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک فن محض خارجی حقائق، واقعات یا جذبات کی لفظی عکاسی کا نام نہیں، بلکہ اس میں رمزیت، ایمائیت اور معنوی تہہ داری بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

اقبال کے نقطۂ نظر کے مطابق شاعری کا کمال اس بات میں نہیں کہ کسی واقعے، تجربے یا احساس کو بعینہٖ اسی صورت میں بیان کر دیا جائے جس طرح وہ محسوس یا مشاہدہ کیا گیا ہو، بلکہ حقیقی فنی عظمت اس میں ہے کہ اظہارِ خیال قاری یا سامع کے ذہن میں غور و فکر، حیرت اور استعجاب کی نئی جہات پیدا کرے۔ اسی حقیقت کو وہ شعر و فلسفہ کے تعلق کے ضمن میں یوں بیان کرتے ہیں:

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

(اقبال، س ن، ص. ۳۸۴)

اقبال کے نزدیک فن کی تکمیل ایک نہایت دشوار، نازک اور پیچیدہ مرحلہ ہے۔ اس منزل سے کامیابی کے ساتھ گزرنا اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر محسوس ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانی احساسات اور جذبات کی بعض کیفیات اس قدر لطیف، نازک اور پیچیدہ ہوتی ہیں کہ الفاظ ان کا پورا بوجھ اٹھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، بعض اوقات زبان کسی احساس کی مکمل معنویت، داخلی کیفیت اور لطافت کو پوری طرح منتقل نہیں کر پاتی۔

ایسی صورتِ حال میں محض وسعتِ مطالعہ یا فکری کاوش کافی نہیں رہتی، بلکہ انسان کو وجدان، باطنی شعور اور قلبی بصیرت سے بھی مدد لینی پڑتی ہے۔ اقبال کے خیال میں بعض حقائق

تک رسائی کے لیے عقل اور مطالعہ کے ساتھ ساتھ دل کی رہنمائی اور ذوقِ سخن بھی ناگزیر ہیں۔ اسی تصور کی ترجمانی وہ اپنے فارسی شعر میں یوں کرتے ہیں:

ہر معنٰی پیچیدہ در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بہ دل در شو شاید کہ تو دریابی
(اقبال، س ن، ص. ۳۳۰)

اس تصور سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال فنی تخلیق کو محض علم و فکر کا نتیجہ نہیں سمجھتے، بلکہ اسے ایک عطیۂ الٰہی بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیقی صلاحیت انسان کو اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے عطا کی جانے والی ایک خاص ودیعت ہے۔ اقبال کے نظریۂ فن کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''اقبال علم و فن، شعر و ادب اور زندگی کے دوسرے مسائل کے بارے میں ایک خاص رائے رکھتے تھے، جو اُن کے خیالات و تجربات کی بنیادوں پر قائم ہوتی تھی۔ اُن کی ایک رائے یہ تھی کہ شعر و ادب کا ملکہ اور ذوقِ سلیم خدا کا عظیم عطیہ اور ناقابلِ تسخیر ہتھیار ہے، جس سے افکار و معاشرت میں انقلاب لایا جا سکتا ہے، فاسد ماحول کے خلاف دلوں میں غضب و انتقام اور طبیعتوں میں اضطراب پیدا کیا جا سکتا ہے، اور غلط نظریات کی جڑ کاٹ کر صالح اور صحت مند اقدار کی آبیاری کی جا سکتی ہے۔ اس لیے شاعر و ادیب کے قلم میں وہ تاثیر اور قوتِ تسخیر ہونی چاہیے جو عصائے موسیٰ، یدِ بیضا اور دمِ عیسیٰ میں تھی۔ اسے دلبری اور قاہری کے ساتھ عالمِ انسانیت میں پیغامبری کا کردار بھی ادا کرنا چاہیے۔(ندوی، س ن، ص. ۹۷)

اقبال کے نزدیک فنی تحریک کا اولین محرک خود فنکار کی داخلی دنیا ہے۔ اگر فنکار کی باطنی کیفیت، روحانی شعور اور داخلی زندگی میں حرارت، زندگی اور بیداری موجود نہ ہو تو خارجی دنیا کا کوئی بھی پہلو، خواہ وہ کتنا ہی معنی خیز، حیات آفریں اور دل کش کیوں نہ ہو، فنی تخلیق کی

صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ اقبال کے نزدیک فنکار کے باطنی شعور اور وجدان کا مؤثر اظہار اسی وقت ممکن ہے جب اس میں اخلاص، صداقتِ احساس اور "خونِ جگر" کی کیفیت شامل ہو۔

اقبال اس امر پر زور دیتے ہیں کہ فن کو اثر آفرینی، گہرائی اور دوام بخشنے کے لیے خلوص اور سچے جذبے کی ناگزیر ضرورت ہے۔ یہی عناصر کسی تخلیق کو وقتی اثر سے بلند کر کے لازوال معنویت عطا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عظیم فن اخلاص کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا، اور نہ ہی کوئی فنکار صداقتِ احساس کے بغیر دوامِ حیات حاصل کر سکتا ہے۔ اس حقیقت کو انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق نظم مسجدِ قرطبہ میں نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے:

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر
(اقبال، س ن، ص. ۳۹۳)

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے نظریۂ فن میں جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی عناصر باہم مربوط ہیں۔ ان کے نزدیک فن محض تفریح، آرائشِ بیان یا حسنِ اظہار کا ذریعہ نہیں، بلکہ انسانی شعور کی بیداری، فکری انقلاب اور اخلاقی تعمیر کا مؤثر وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے ہاں فن زندگی کی اعلیٰ اقدار کے فروغ اور انسان کے روحانی ارتقا کا ایک فعال، بامقصد اور تعمیری محرک بن جاتا ہے۔

اقبال کے نظریۂ فن میں مقصدیت اور حیات آفرینی

علامہ محمد اقبال کے نزدیک فن کی اصل غایت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے لیے مسرت افزا، حوصلہ بخش اور حیات آفرین ثابت ہو۔ اگر کسی فن پارے میں زندگی کو بیدار کرنے، انسان کے باطن میں ولولہ پیدا کرنے اور اسے اعلیٰ مقاصد کی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو تو اقبال کی نظر میں وہ فن بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک فن اور فنکار دونوں کی بقا اسی وقت ممکن ہے جب ان کی تخلیقات بنی نوعِ انسان کے لیے دائمی طور پر روح پرور، ولولہ انگیز اور زندگی بخش ثابت ہوں۔ فن کے اس مقصد کو واضح کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں:

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

(اقبال، س ن، ص. ۵۸۰)

یہ اشعار اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک فن کا بنیادی مقصد انسانی زندگی میں حرارت، حرکت اور دوام پیدا کرنا ہے۔ وہ ایسے فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو انسان کے باطن میں زندگی کی نئی امنگیں پیدا کرے، اس کے شعور کو بیدار کرے اور اسے بلند تر مقاصد کے حصول پر آمادہ کرے۔

اقبال بنیادی طور پر زندگی کے شاعر ہیں، اس لیے وہ فن کو زندگی کا خادم، معاون اور محرک تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی اور فن کے باہمی تعلق کو اپنے فارسی اشعار میں نہایت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

علم و فن از پیشِ خیزانِ حیات
علم و فن از خانہ زادانِ حیات

(اقبال، س ن، ص. ۱۷)

اس تصور میں زندگی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کے نظریۂ حیات اور نظریۂ فن دونوں کی بنیاد اسی حقیقت پر قائم ہے کہ زندگی اصل قدر ہے، جب کہ علم و فن اسی کے مظاہر، وسائل اور معاون قوتیں ہیں۔ اقبال کے نظریۂ فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے شیخ محمد علی لکھتے ہیں:

''اقبال آرٹ برائے آرٹ کے قطعی قائل نہ تھے اور آرٹ کو وہ زندگی سمجھتے تھے۔'' (محمد علی، س ن، ص.٦٦٧)

اقبال کے نزدیک انسان کا دنیا میں آنا محض زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا کو بہتر، حسین تر اور زیادہ بامعنی بنانے کے لیے ہے۔ انسان فطرت کے مظاہر سے مسلسل نبرد آزما رہتا ہے اور اپنی محنت، جفاکشی، فکری قوت اور تخلیقی صلاحیت کے ذریعے کائنات کی مخفی طاقتوں کو مسخر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی عمل دراصل تخلیقِ کائنات میں انسان کی شعوری شرکت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تصور کو اقبال نے نہایت خوبصورتی سے یوں بیان کیا ہے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیاباں و کہسار و راغ آفریدی
خیاباں و گلزار و باغ آفریدم

(اقبال، س ن، ص.٢٨٤)

اقبال کے نزدیک ہر فن کا بنیادی مقصد زندگی کی تاریکیوں کو روشنی میں بدلنا اور حیاتِ انسانی کو زیادہ خوب صورت، بامقصد اور تابناک بنانا ہے۔ فن کا اصل فریضہ یہ ہے کہ وہ فرد اور معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف لے جائے، اس کے اندر حیاتِ جاوداں کا سوز پیدا کرے، اسے انقلابی جذبوں سے آشنا کرے اور اسے مسلسل نئی منزلوں کی جستجو پر آمادہ رکھے۔ اقبال کے متعدد اشعار ان کے اس مقصدی تصورِ فن کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں:

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورتگری و شاعری ونائے و سرود

(اقبال، س ن، ص.٥٧٧)

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے تعمیر
میخانہ حافظ ہو کہ بتخانہء بہزاد

(اقبال، س ن، ص.۵۳۹)

فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنر مند
شام اس کی ہے مانند سحر صاحبِ پرتو

(اقبال، س ن، ص.۶۲۹)

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

(اقبال، س ن، ص.۵۰۴)

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک فن کا حقیقی معیار اس کی تخلیقی، تعمیری اور انقلابی قوت ہے۔ ایسا فن جو خودی کی تعمیر، انسان کی روحانی بالیدگی اور معاشرتی ارتقا میں معاون نہ ہو، اپنی اصل معنویت کھو دیتا ہے۔

علامہ اقبال کا یہ بھی نظریہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کے اندر قوت، اعتماد اور عزم پیدا کرے، قابلِ قدر ہے، اور ہر وہ شے جو کمزوری، جمود اور بے عملی کو فروغ دے، مذموم ہے۔ اگر اسی اصول کو فن پر منطبق کیا جائے تو فن کا بنیادی مقصد بھی انسانی شخصیت کی تعمیر و تقویم قرار پاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک فن حسن کا مظہر ہے، اور فنکار کا اصل فریضہ حسن کے اسرار و انوار کو آشکار کرنا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن
خیزد از سینائے او انوارِ حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر
فطرت از افسونِ او محبوب تر

(اقبال، س ن، ص.۹۹)

ان اشعار میں اقبال نے شاعر اور فنکار کو حسنِ ازل کے ترجمان کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک فنکار اپنی بصیرت، تخیل اور جمالیاتی شعور کے ذریعے حسن کو مزید نکھارتا اور فطرت کو زیادہ دل آویز بنا دیتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے نظریۂ فن میں حسن، زندگی، خودی اور تخلیق باہم مربوط تصورات کی حیثیت رکھتے ہیں، جو انسان کی فکری، روحانی اور تہذیبی ترقی کا وسیلہ بنتے ہیں۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا نظریۂ فن مقصدیت، حیات آفرینی، تعمیرِ خودی اور ارتقائے انسانیت کے اصولوں پر استوار ہے۔ ان کے نزدیک فن زندگی سے الگ کوئی مستقل اور خود مختار حقیقت نہیں، بلکہ زندگی کے فروغ، انسانی شعور کی بیداری اور تہذیبی ارتقا کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر اقبال فن کو محض جمالیاتی مسرت کا وسیلہ نہیں سمجھتے، بلکہ اسے ایک فعال، تعمیری اور انقلابی قوت کے طور پر دیکھتے ہیں۔

اقبال کا تصورِ فن: فن برائے زندگی اور تخلیقی حیات

علامہ محمد اقبال نے ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کے مباحث پر نہایت وضاحت، گہرائی اور فکری استحکام کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے نزدیک ''فن برائے فن'' کا نظریہ ایک فریبِ نظر، سطحی ملمع سازی اور محض لفظی صناعی کے مترادف ہے۔ اقبال کے خیال میں ایسا فن ایک خوش رنگ مگر تلخ اثرات رکھنے والے پھل کی مانند ہے، جس کے نتائج فرد اور معاشرے دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ایسے فن کو ایک بے روح جسم اور ایسی بے جان تصویر سے تعبیر کرتے ہیں جو حرکت پذیر ہونے کے باوجود عالمِ تصاویر سے نکل کر عالمِ حیات میں داخل نہیں ہو سکتی (نوشاہی، ۱۹۸۳، ص. ۲۷۴)۔

اقبال فن میں محض جذباتیت اور احساس پرستی کے بھی مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک فنکار کو افلاطونی تقلید کے بجائے تخلیقی بصیرت سے کام لینا چاہیے۔ آرٹ کا مقصد انسان کو خوابِ غفلت میں مبتلا کرنا نہیں، بلکہ اس کی روح کو بیدار کرنا اور اس کی زندگی کو توانائی، حرکت اور

مقصدیت عطا کرنا ہے۔ فن حقیقت سے فرار کا نام نہیں، بلکہ حقیقت کی تشکیل، تعمیر اور معنوی تعبیر کا عمل ہے۔ اقبال کا اپنا فن بھی اسی معیار پر پورا اترتا ہے؛ وہ زندگی کے مسائل، اس کے تضادات اور اس کے گہرے مظاہر کو نہایت بیدار شعور اور فکری بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

اس جہاں میں اِک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے
کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے
قافلے والے بھی ہیں، اندیشۂ رہزن بھی ہے؟
(اقبال، س ن، ص.۳۹)

اقبال کے فن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع کو محض ذاتی یا انفرادی سطح پر محدود نہیں رہنے دیتے، بلکہ اسے اجتماعی اور آفاقی معنویت عطا کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ ہمالیہ سے مخاطب ہوں، شمع سے گفتگو کریں، خفتگانِ خاک کو پکاریں یا بادل اور موٹر جیسے جدید موضوعات پر اظہارِ خیال کریں، ان کی شاعری انفرادی احساس کو اجتماعی شعور سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ ان کے نزدیک فن بلند انسانی جذبات، اعلیٰ مقاصد اور زندگی بخش تصورات کے اظہار کا نام ہے۔ اس اعتبار سے فن کی اصل اہمیت ان اشیا میں نہیں جن کا ذکر کیا جاتا ہے، بلکہ اس تخلیقی زاویۂ نگاہ میں ہے جس کے ذریعے فنکار ان اشیا کو نئی معنویت اور فکری وسعت عطا کرتا ہے۔

اقبال نے زبورِ عجم میں غلام اقوام کے فنون کے موضوع پر بھی خصوصی بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک حقیقی فنونِ لطیفہ صرف آزاد اقوام میں نشوونما پاتے ہیں، جب کہ غلام قوموں کا فن اپنی تخلیقی قوت، روحانی حرارت اور زندگی بخش تاثیر سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس تصور کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

(اقبال، س ن، ص. ۵۴۰)

اسی طرح وہ اپنے فکری رجحان کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ بازی کا

(اقبال، س ن، ص. ۳۲۴)

یہ اشعار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اقبال کی شاعری محض جمالیاتی لطف، رومانوی کیفیت یا لفظی آرائش تک محدود نہیں، بلکہ اس کا بنیادی مقصد انسانی خودی، عمل، آزادی، اجتماعی بیداری اور تخلیقی حیات کو تقویت دینا ہے۔

اقبال فن برائے فن کے نظریے کے شدید ناقد ہیں۔ اس ضمن میں وہ نہایت واضح انداز میں لکھتے ہیں:

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منتہائے مقصود خود آرٹ ہے، وہ نادانستہ طور پر گمراہ کرنے اور ہماری زندگی اور توانائی کو فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے لیے ازبس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں'' (طارق، ۱۹۳۴، ص. ۲۸۰)

اسی تصور کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تمام انسانی سرگرمیوں کا آخری مقصود ایک پر شکوہ، پُر قوت اور بامعنی زندگی ہے۔ ان کے نزدیک فنونِ لطیفہ کو بھی اسی مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بننا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تمام انسانی سرگرمیوں کا انتہائی مقصد زندگی ہے: پر شکوہ، پُر قوت، مالا مال زندگی۔ تمام انسانی فنون کے سامنے یہی مقصد ہونا چاہیے اور ہر چیز کی قدر

اس کی حیات بخش قابلیت کے مطابق مقرر کی جانی چاہیے۔ بلند ترین آرٹ
وہ ہے جو ہماری سوئی ہوئی قوتِ ارادہ کو بیدار کرے اور ہمارے اندر امتحان
کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرے" (ادبی دنیا، ۱۹۳۴)۔

اقبال نے اپنی نظم "بہ عنوانِ تھیٹر" میں ڈرامے کی ان صورتوں پر تنقید کی ہے جو انسان کی خودی کو کمزور کرتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

حریم تیرا خودی غیر کی معاذاللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تُو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

(اقبال، س ن، ص.۵۶۸)

اگرچہ اقبال افلاطون کے برعکس فن کو محض نقلِ فطرت نہیں سمجھتے، تاہم وہ حسنِ فطرت کے عظیم مداح ہیں۔ ان کے نزدیک فنکار کا عمل بنیادی طور پر تخلیقی ہوتا ہے، اور تخلیق و نقل دو الگ حقیقتیں ہیں۔ زندگی کی صحت مندی، توانائی اور ارتقا کا راز اسی میں ہے کہ انسان موجود حقائق کے سامنے محض سرِ تسلیم خم نہ کرے، بلکہ ان کے خلاف تخلیقی مزاحمت کرتے ہوئے نئے مقاصد، نئی قدریں اور نئی معنویت پیدا کرے۔ اسی لیے وہ فنکار کو تلقین کرتے ہیں:

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر

(اقبال، س ن، ص.۵۷۹)

اقبال کی رائے میں وہ فنکار جو محض فطرت کا چربہ اتارتا ہے، دراصل فطرت کا گداگر ہے؛ جب کہ وہ فنکار جو فطرت کی بنیاد پر ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے، تخلیقِ نو کا فریضہ انجام دیتا

ہے اور اپنی ذات کے پوشیدہ امکانات کو آشکار کرتا ہے۔ ایسی تخلیقات ہی ابدی حسن اور دائمی معنویت کی حامل ہوتی ہیں۔

انسانی تہذیب کی ترقی بھی اسی تخلیقی عمل کا نتیجہ ہے۔ انسان نے افادی فنون کے ذریعے فطرت کی محض نقل نہیں کی، بلکہ اسے سنوارا، نکھارا اور اس میں اضافہ کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک فن زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر وہ آرٹ کو محض تفریح یا لفظی آرائش نہیں سمجھتے، بلکہ اسے ایک تخلیقی، تعمیری اور حیات بخش عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی محض جسمانی بقا یا شب و روز کی گردش کا نام نہیں، بلکہ ایک عظیم تخلیقی حقیقت اور رازِ کائنات ہے، جس کا سب سے اعلیٰ مظہر انسان ہے۔

اسی لیے اقبال کے نزدیک فن کا مقصد زندگی کو خوش گوار، حسین، بامعنی اور تابناک بنانا ہے؛ محرومی کو شادکامی، ناکامی کو کامیابی اور تاریکی کو روشنی میں بدل دینا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے فطرت پر غلبہ، رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور تخلیقی عزم درکار ہے۔ اقبال کے نزدیک عظیم فنکار اپنے عہد کا محض مطیع نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ناقد، مصلح اور معمار ہوتا ہے۔ اس کا تعلق "بازمانہ بساز" کے بجائے "بازمانہ ستیز" سے ہوتا ہے۔ ایسا فنکار الٰہی صفات کو اپنے اندر جذب کر کے تخلیقی قوت کا مظہر بن جاتا ہے۔

اسی تخلیقی اور انقلابی فن کا تصور اقبال ان اشعار میں پیش کرتے ہیں:

دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے

(اقبال، س ن، ص. ۵۸۴)

ان اشعار میں اقبال نے فنکار کے لیے جو معیار متعین کیا ہے، وہ محض حسنِ اظہار یا فنی دل کشی تک محدود نہیں، بلکہ تخلیقِ نو، تسخیرِ فطرت، تعمیرِ خودی اور ارتقائے انسانیت پر مبنی ہے۔ چنانچہ اقبال کا نظریۂ فن خالصتاً مقصدی، حیات آفریں، اخلاقی اور تخلیقی نوعیت کا حامل ہے، جس میں فن کو انسانی زندگی کی تعمیر، بیداری اور ارتقا کا مؤثر ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

اقبال کے نظریۂ فن میں خودی، مقصدیت اور تخلیقی ارتقا

علامہ محمد اقبال کے نزدیک فن کا حقیقی جوہر مسلسل تخلیقی ارتقا، تسخیرِ فطرت اور زندگی کی تعمیر و توسیع میں پوشیدہ ہے۔ ان کے تصورِ فن میں ہنرمند محض موجود حقیقت کا مشاہدہ کرنے والا فرد نہیں، بلکہ وہ ایک فعال، تخلیقی اور تغیر آفرین قوت ہے۔ جب فنکار تخلیقی تسخیر کی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے تو وہ کسی ایک منزل پر قانع نہیں رہتا؛ اس کی نظر ہمیشہ ''خوب سے خوب تر'' کی تلاش میں رہتی ہے۔ اس کے نزدیک ہر کامیابی ایک نئے امکان کا دروازہ کھولتی ہے اور ہر منزل اسے کسی بلند تر مقصد کی طرف لے جاتی ہے۔ اقبال اسی تخلیقی بے قراری اور ارتقائی اضطراب کو اپنے درجِ ذیل اشعار میں بیان کرتے ہیں:

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نہ سازد
دلِ نا صبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
زشرر ستارہ جویم، زستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

(اقبال، س ن، ص.۲۹۷)

یہ اشعار اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک فنکار کی اصل شناخت اس کی تخلیقی بے قراری، جستجو، حرکت اور ارتقائی شعور میں مضمر ہے۔ وہ جمود، قناعتِ محض اور سکونِ بے عمل کو فن کی روح کے منافی سمجھتے ہیں۔ فنکار کا کام موجود پر اکتفا کرنا نہیں، بلکہ موجود سے آگے بڑھ کر نئے امکانات، نئی صورتوں اور نئی معنویتوں کو جنم دینا ہے۔ تاہم اقبال کے

نزدیک تسخیرِ فطرت اور تخلیقِ حیات کا یہ جذبہ اسی وقت مؤثر قوت میں تبدیل ہوتا ہے جب فنکار عزم، یقین اور اعتمادِ ذات سے سرشار ہو۔

اسی بنا پر اقبال یقین کو تخلیقی عمل کی بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شک، تردد اور بے یقینی انسان کی تخلیقی قوتوں کو کمزور کر دیتے ہیں، جبکہ یقین انسان کے اندر تحقیق، ایجاد، جرأتِ اظہار اور جدت آفرینی کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ یقین ہی وہ باطنی مرکز ہے جہاں سے فنکار کی تخلیقی توانائی پھوٹتی ہے اور وہ نقشِ نو پیدا کرنے کے قابل بنتا ہے۔ اقبال اس تصور کو یوں بیان کرتے ہیں:

بے یقیں را لذتِ تحقیق نیست
بے یقیں را قوتِ تخلیق نیست
بے یقیں را رعشہ ہا اندر دل است
نقشِ نو آوردن او را مشکل است
زندگی بے قوتِ اعجاز نیست
ہر کسے داندۂ ایں راز نیست

(اقبال، س ن، ص.۵۷۹)

اقبال کے نزدیک یقین دراصل خودی کے استحکام کا دوسرا نام ہے۔ اسی لیے وہ ہنرمند سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ پہلے اپنی خودی کو دریافت کرے، اپنی باطنی قوتوں سے آگاہ ہو اور اپنے وجود کے تخلیقی امکانات کو بروئے کار لائے۔ بیدار خودی ہی کمالِ فن کی حقیقی بنیاد ہے، کیونکہ فن اسی وقت زندگی بخش بنتا ہے جب وہ انسان کی شخصیت کو مضبوط کرے، اس کے باطن کو بیدار کرے اور اسے عمل، تخلیق اور تعمیر کی راہ پر گامزن کرے۔ جو فن خودی کی تعمیر اور حفاظت کا ذریعہ نہ بن سکے، وہ اپنی اصل معنویت سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں:

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود اُن کی
بلند تر ہے ستاروں سے اُن کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رُسوائی
خودی سے جب ادب و دین ہوئے بیگانہ

(اقبال، س ن، ص. ۵۶۲)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک ادب، سیاست، مذہب، علم اور فن سب کی اصل قدر و قیمت خودی کے استحکام سے وابستہ ہے۔ اگر یہ عناصر خودی کی حفاظت، نشوونما اور بلندی کا ذریعہ بنیں تو عینِ حیات ہیں؛ لیکن اگر یہ خودی سے بیگانہ ہو جائیں تو محض فریب، افسانہ اور ظاہری دل کشی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس طرح اقبال کا نظریۂ فن خودی، یقین، مقصدیت اور تخلیقی ارتقا کے ایک مربوط نظام کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جس میں فن زندگی کی تعمیر، انسان کی باطنی بیداری اور کائنات کی تخلیقی تسخیر کا مؤثر وسیلہ بن جاتا ہے۔

اقبال کے نظریۂ فن میں مقاصدِ حیات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک فن کی نوعیت، افادیت اور معیار کا تعین اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ کس مقصد کی خدمت کر رہا ہے۔ اگر مقصد بلند، پاکیزہ، حیات بخش اور انسان دوست ہو تو فن بھی اسی نسبت سے بامعنی، مؤثر اور دیرپا بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر فن کا تعلق کسی اعلیٰ مقصد سے منقطع ہو جائے تو وہ محض لفظی آرائش یا جمالیاتی مشغلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی لیے اقبال ہنر مند کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنی تخلیقی قوتوں کو بلند مقاصد کے تابع کرے:

اے زِ رازِ زندگی بیگانہ خیز
از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
مقصدے از آسماں بالا ترے
دلرُبائے، دلستانے، دلبرے
باطلِ دیرینہ را غارتگرے
فتنہ در جیبے سراپا محشرے
مقصدے مثلِ سحر تابندہء
ماسوا را آتشِ سوزندہء

(اقبال، س ن، ص.۱۷)

ان اشعار میں اقبال نے مقصدِ حیات کو تخلیقی عمل کا حقیقی سرچشمہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک وہی فن زندہ، مؤثر اور قابلِ قدر ہے جو انسان کو اعلیٰ مقاصد سے وابستہ کرے، فرسودہ تصورات کو چیلنج کرے، باطل قدروں کی نفی کرے اور زندگی میں نئی فکری، اخلاقی اور روحانی توانائی پیدا کرے۔

اس کے ساتھ ساتھ اقبال تخلیق، ارتقا، ندرتِ فکر اور انقلاب آفرینی کو بھی تکمیلِ فن کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فن کا کام محض موجودہ حالات کی عکاسی کرنا نہیں، بلکہ ان کے اندر نئی روح، نئی معنویت اور نئی سمت پیدا کرنا ہے۔ فنکار صرف مشاہدہ کرنے والا نہیں، بلکہ معنی پیدا کرنے والا اور زندگی کو تازہ امکانات سے آشنا کرنے والا تخلیقی وجود ہے۔ اسی تناظر میں اقبال فرماتے ہیں:

عشق اب پیرویٔ عقلِ خداداد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے

یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

(اقبال، س ن، ص.۵۵۶)

یہ اشعار واضح کرتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک عظیم فن وہ ہے جو پرانے سانچوں میں نئی روح پھونک دے یا فرسودہ ذہنیت کو تقلید کے بندھنوں سے آزاد کر دے۔ اقبال کے ہاں فن کا اصل فریضہ فکری اور روحانی تجدید ہے؛ یعنی وہ انسان کو جمود، تقلید اور بے عملی سے نکال کر تخلیق، حرکت اور خود آگہی کی طرف لے جائے۔

اقبال مزید واضح کرتے ہیں کہ جس ہنر مند میں نئی روح بیدار کرنے، نئے امکانات دریافت کرنے اور زندگی کو تازہ معنویت عطا کرنے کی صلاحیت موجود ہو، اس کے فن کے مظاہر فطرت کے مظاہر سے بھی زیادہ دل کش، بامعنی اور اثر انگیز ہو جاتے ہیں۔ ایسا فنکار محض موجودہ دنیا کی تصویر کشی نہیں کرتا، بلکہ اپنی تخلیقی قوت سے ایک نئی دنیا آباد کرتا ہے:

آں ہنر مندے کہ بر فطرت فزود
رازِ خود را بر نگاہِ ما کشود
آفریند کائناتِ دیگرے
قلب را بخشد حیاتِ دیگرے

(اقبال، س ن، ص.۵۸۰)

ان اشعار میں اقبال نے تخلیقی فنکار کو محض مقلد یا مصورِ فطرت نہیں، بلکہ شریک تخلیق کے مقام پر فائز کیا ہے۔ ایسا ہنر مند اپنی خودی کی قوت، باطنی بصیرت اور تخلیقی شعور کے ذریعے نئی فکری اور روحانی دنیائیں آباد کرتا ہے، انسانی قلب و نظر کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور زندگی کو پہلے سے زیادہ وسیع، روشن اور بامقصد بنا دیتا ہے۔

اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے نظریۂ فن میں خودی، یقین، مقصدیت، تخلیقی ارتقا اور انقلاب آفرینی بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فن کی اصل

قدر صرف اس کی جمالیاتی دل کشی میں نہیں، بلکہ اس کی حیات آفریں، تعمیری اور ارتقائی قوت میں مضمر ہے۔ چنانچہ اقبال کا تصورِ فن ایک فعال، متحرک اور زندگی بخش نظریہ ہے، جو انسان کو مسلسل تخلیق، جستجو، خود آگہی اور تکمیلِ ذات کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اقبال کے نظریۂ فن میں آزادی، تخلیقیت اور جمال و جلال

علامہ محمد اقبال کے نظریۂ فن کا ایک نہایت اہم پہلو آزادیِ فکر، خودی کے استحکام اور تخلیقی اصالت سے وابستہ ہے۔ اقبال کے نزدیک فن کی حقیقی نشوونما آزاد ذہن، بیدار خودی اور تخلیقی جرأت کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ غلامانہ ذہنیت اور محض نقالی کو فن کے ارتقا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں غلامی صرف سیاسی یا معاشرتی محکومی کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی ذہنی اور روحانی کیفیت ہے جو زندگی کے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہے اور انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج بنا دیتی ہے۔ اسی لیے غلام قوموں کا فن زندگی کی عظمت، تخلیقی جرأت اور روحانی حرارت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسا فنکار نہ عزم و یقین کی دولت رکھتا ہے، نہ لذتِ تحقیق سے آشنا ہوتا ہے اور نہ اس کے اندر تخلیقِ نو کی قوت باقی رہتی ہے۔ اقبال اس صورتِ حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

مرگ ہا اندر فنونِ بندگی
من چہ گویم از فسونِ بندگی
نغمۂ او خالی از نارِ حیات
ہم چوں سیل اُفتد بہ دیوارِ حیات
کیشِ او تقلید و کارش آزری ست
ندرت اندر مذہبِ او کافری ست

(اقبال، س ن، ص. ۵۷۶)

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک غلامی کا فن تقلید، جمود اور فکری بانجھ پن کا مظہر ہے۔ اس میں نہ جدت ہوتی ہے، نہ ندرت، نہ تخلیقی بصیرت اور نہ زندگی کو نئی جہتیں عطا کرنے کی صلاحیت۔ ایسا فن محض صورت گری تو کر سکتا ہے، مگر زندگی کے باطن میں کوئی تازہ حرارت یا معنوی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔

اقبال کا خیال ہے کہ زوال پذیر اور محکوم ذہنیت رکھنے والے اہلِ فن عموماً ایسے فلسفیانہ تصورات سے متاثر ہوتے ہیں جو انسان کو عمل، حرکت اور تخلیق کے بجائے خواب، سکون اور بے عملی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک افلاطونیت کی بعض تعبیرات نے بھی فن کو زندگی کی حرارت سے دور کر کے ایک خواب آلود اور غیر عملی فضا میں پہنچا دیا۔ اسی لیے وہ فرماتے ہیں:

موت کی نقش گری اُن کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

(اقبال، س ن، ص. ۵۹۱)

اسی تصور کو وہ ایک اور مقام پر یوں بیان کرتے ہیں:

سوزِ دل از دل برد غم می دہد
زہر اندر ساغرِ جم می دہد

(اقبال، س ن، ص. ۳۹۰)

ان اشعار میں اقبال اس فن پر تنقید کرتے ہیں جو انسان کے دل سے حرارتِ حیات چھین لیتا ہے اور اس کے اندر عمل، جستجو اور تخلیقی اضطراب پیدا کرنے کے بجائے مایوسی، بے

عملی اور خواب آلودگی کو فروغ دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ایسا فن انسان کی قوتِ ارادہ کو بیدار نہیں کرتا، بلکہ اسے کمزور، منفعل اور زندگی کے حقیقی مطالبات سے غافل بنا دیتا ہے۔

غلامانہ فن کے برعکس اقبال آزاد اقوام کے فن کو عظمت، جلال، استحکام اور تخلیقی قوت کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ وہ بالخصوص مسلم تہذیب کے عہدِ عروج کے فنِ تعمیر کو اس کی روحانی گہرائی، تہذیبی وقار اور تخلیقی عظمت کی بنا پر سراہتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی فن پارے کی اصل قدر محض اس کے ظاہری حسن یا فنی تناسب میں نہیں، بلکہ اس روحانی کیفیت میں ہوتی ہے جو اس کے خالق کے باطن کی ترجمان ہو۔ فن پارہ اپنے خالق کے ایمان، احساس، فکر اور روحانی مقام کا آئینہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

نقش سوئے نقش گرمی آورد
از ضمیرِ او خبر می آورد

(اقبال، س ن، ص. ۵۸۵)

یعنی ہر تخلیق اپنے خالق کے باطن، اس کے عقیدے، اس کے احساس اور اس کے روحانی مقام کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کے نظریۂ فن میں آزادی، تخلیقیت، جمال اور جلال ایک دوسرے سے الگ نہیں، بلکہ باہم مربوط عناصر ہیں۔ حقیقی فن وہی ہے جو آزاد خودی سے جنم لے، زندگی کی قوتوں کو بیدار کرے، تخلیقِ نو کا حوصلہ پیدا کرے اور انسان کو جمود و تقلید سے نکال کر عمل، بیداری اور روحانی بلندی کی طرف لے جائے۔

اسی تناظر میں مسجدِ قرطبہ اقبال کے نزدیک مسلم فنِ تعمیر کا ایک بے مثال شاہکار بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کی عظمت محض اس کے ظاہری حسن، تناسب، وسعت یا تعمیراتی کمال میں نہیں، بلکہ اس ایمانی حرارت، روحانی سوز اور تہذیبی جلال میں پوشیدہ ہے جو اس کی بنیادوں میں کارفرما ہے۔ اقبال کے لیے مسجدِ قرطبہ صرف ایک تاریخی عمارت نہیں، بلکہ مسلمان کی

تخلیقی خودی، ایمانی قوت اور تہذیبی عظمت کی زندہ علامت ہے۔ مسجدِ قرطبہ کے مشاہدے نے اقبال کے اندر جو جذبات پیدا کیے، وہ ان کی شہرۂ آفاق نظم مسجدِ قرطبہ میں محفوظ ہیں:

کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت، اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

(اقبال، س ن، ص. ۳۹۰)

اس کے برعکس اقبال کو جدید مغربی تہذیب کی بعض تعمیرات میں وہ روحانی جوہر اور ایمانی مرکزیت دکھائی نہیں دیتی جو اسلامی فن کا اصل امتیاز ہے۔ ان کے نزدیک اگر کسی تعمیر میں مذہبی صورت تو موجود ہو مگر اس کی روح ایمانی حرارت سے خالی ہو، تو وہ محض ظاہری آرائش رہ جاتی ہے۔ چنانچہ پیرس کی مسجد کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

حرم نہیں ہے فرنگی کرشمہ سازوں نے
تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بتخانہ

(اقبال، س ن، ص. ۵۶۵)

اقبال کے نزدیک فن کی تکمیل صرف جمال سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے جلال بھی ناگزیر ہے۔ حسن اگر قوت، عظمت، روحانی اقتدار اور اخلاقی تاثیر سے خالی ہو تو وہ محض دل فریبی بن کر رہ جاتا ہے۔ حقیقی فن وہ ہے جس میں جمال کی دل کشی اور جلال کی قوت دونوں ہم آہنگ ہوں۔ اسی تصور کو وہ نہایت جامع انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

دلبری بے قاہری جادو گری ست
دلبری با قاہری پیغمبری است

(اقبال، س ن، ص. ۵۸۷)

یعنی وہ حسن جو قوت اور اقتدار سے محروم ہو، محض جادوگری ہے، جبکہ وہ حسن جو قوت اور اثر آفرینی سے ہم آہنگ ہو، پیغمبرانہ کردار ادا کرتا ہے۔

اسی مفہوم کی وضاحت ایک اور شعر میں یوں کرتے ہیں:

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

(اقبال، س ن، ص. ۵۸۵)

اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک فن کی اصل تاثیر اس کی روحانی حرارت، قوتِ اثر اور انقلابی توانائی میں مضمر ہے۔ ایسا حسن جو انسانی ارادے کو مضبوط نہ کرے، انسان کے باطن میں حرکت و عمل کی آگ روشن نہ کرے اور زندگی کو نئی معنویت نہ دے، اپنی حقیقی قدر کھو دیتا ہے۔

اقبال فنکار کے باطن اور اخلاقی شخصیت کو بھی فن کی تاثیر کے لیے بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر فنکار کا ضمیر پاک، بیدار اور صاحبِ یقین نہ ہو تو اس کا فن بھی انسان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

(اقبال، س ن، ص. ۵۹۳)

اس شعر میں اقبال نے فن اور اخلاق کے باہمی تعلق کو نہایت مؤثر انداز میں واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک فنکار کا باطن اگر پاکیزگی، صداقت اور روحانی بیداری سے محروم ہو تو اس کا فن بھی تعمیر کے بجائے تخریب کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

مجموعی طور پر اقبال کے نظریۂ فن میں آزادیِ فکر، تخلیقی اصالت، استحکامِ خودی، روحانی سوز، جمال و جلال کا امتزاج اور اخلاقی پاکیزگی بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے

نزدیک عظیم فن وہی ہے جو زندگی کو قوت بخشے، انسان کے اندر عمل، یقین اور تخلیق کی روح بیدار کرے، اور اسے تسخیرِ کائنات، تعمیرِ خودی اور ارتقائے انسانیت کی طرف رہنمائی فراہم کرے۔

اقبال کے نظریۂ فن میں اعجازِ ہنر، حیاتِ ابدی اور مقصدیتِ شاعری

علامہ محمد اقبال کے نظریۂ فن میں ہنر کی اصل قدر محض ظاہری حسن، لفظی نزاکت یا فنی چابک دستی میں نہیں، بلکہ اس باطنی قوت میں ہے جو فنکار کے قلب و روح سے پھوٹتی ہے۔ اقبال کے نزدیک حقیقی فن وہ ہے جس میں ہنر مند کی داخلی کیفیت، سوزِ دروں، یقین کی قوت اور حرارتِ حیات پوری شدت کے ساتھ منعکس ہو۔ ایسا فن صرف جمالیاتی لذت فراہم نہیں کرتا، بلکہ اعجازِ ہنر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دراصل اقبال کے نزدیک فن کا اعلیٰ ترین منصب یہی اعجاز آفرینی ہے؛ یعنی ایسا تخلیقی اثر جو فرد اور قوم دونوں کی زندگی میں حرکت، بیداری، خود اعتمادی اور ارتقا پیدا کرے۔ اس تصور کو وہ درج ذیل اشعار میں نہایت وضاحت سے بیان کرتے ہیں:

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

(اقبال، س ن، ص. ۵۸۰)

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک فن کا اصل معیار اس کی حیات آفریں قوت اور انقلابی تاثیر ہے۔ وہ ایسے فن کو بے حقیقت سمجھتے ہیں جو قوموں کے اندر خود اعتمادی، عمل، بیداری اور ارتقا کا جذبہ پیدا نہ کر سکے۔ اقبال کے ہاں ہنر اسی وقت معنی خیز بنتا ہے

جب وہ محض مشاہدے یا اظہار تک محدود نہ رہے، بلکہ زندگی کو بدلنے، انسان کو جگانے اور قوم کو نئی سمت عطا کرنے کی قوت رکھتا ہو۔

یہی تصور اقبال کی شاعری کی بنیاد بھی ہے۔ ان کے کلام میں جو ولولۂ حیات، جوشِ عمل، امید، ہمت اور جدوجہد کا پیغام ملتا ہے، وہ اسی نظریۂ فن کا عملی اظہار ہے۔ تاہم اقبال اس فکری مقام تک اچانک نہیں پہنچے؛ وسیع مطالعے، گہرے تجربات، تہذیبی مشاہدے اور طویل ذہنی و روحانی کشمکش کے بعد انہوں نے شاعری کے حقیقی مقصد کو دریافت کیا۔ فطرت سے ان کی والہانہ محبت، پہاڑوں، دریاؤں، آسمانوں اور وطن کی خاک سے ان کی وابستگی بھی اسی ارتقائی فکری سفر کی علامتیں ہیں، جن کے ذریعے ان کا شعری شعور بتدریج مقصدیت، خودی اور حیات آفرینی کی طرف بڑھتا ہے۔

اقبال کے نظریات کا منظم اور واضح اظہار پہلی مرتبہ اسرارِ خودی میں سامنے آتا ہے۔ یہ مثنوی نہ صرف ان کے فلسفۂ خودی کی ترجمان ہے، بلکہ ان کے نظریۂ فن کی بھی جامع توضیح پیش کرتی ہے۔ درحقیقت اسرارِ خودی اقبال کے تصورِ حیات، مقصدی شاعری اور تخلیقی رسالت کا ایک اہم شاہکار ہے۔ اس مثنوی کے آغاز ہی میں وہ اپنے مقصدِ شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست

(اقبال، س ن، ص.۱۱)

یہ اشعار اس امر کی صریح وضاحت کرتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک شاعری محض لفظی صناعی، تخیل آرائی یا حسنِ بیان کا نام نہیں، بلکہ ایک اعلیٰ فکری اور روحانی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وہ شاعری کو خود مقصد نہیں بناتے، بلکہ اسے مقصد کے اظہار، خودی کی بیداری اور حیاتِ انسانی کی تعمیر کا مؤثر وسیلہ سمجھتے ہیں۔

اقبال کی نظر میں وہی شاعری حقیقی معنوں میں زندہ اور مؤثر ہے جو انسان کو حیاتِ ابدی کا شعور عطا کرے، اس کی قوتِ ارادی کو بیدار کرے اور اسے اعلیٰ مقاصد کے لیے آمادہ کرے۔ اسی لیے وہ ایسے شعر کو فرشتۂ وحی اور صورِ اسرافیل کی صدا سے تشبیہ دیتے ہیں:

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

(اقبال، س ن، ص. ۵۹۵)

اس شعر میں اقبال نے شاعری کی روحانی اور تہذیبی ذمہ داری کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک شاعری محض جذبات کی ترجمان نہیں، بلکہ حیات بخش پیغام کی حامل ہونی چاہیے۔ وہ شعر کو اس وقت معتبر سمجھتے ہیں جب وہ انسان کے باطن کو بیدار کرے، اس کی مردہ قوتوں کو جگائے اور اسے زندگی کے بڑے مقاصد سے وابستہ کر دے۔

اقبال کی شاعری کا ایک بنیادی مقصد ملتِ اسلامیہ کے اندر وحدتِ قومی اور شعورِ توحید کو فروغ دینا بھی ہے۔ ان کے نزدیک توحید صرف ایک مذہبی عقیدہ نہیں، بلکہ ایک زندہ اجتماعی قوت ہے جو قوموں کی بقا، استحکام اور حیاتِ دوام کی ضامن بنتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

(اقبال، س ن، ص. ۵۹۵)

اس شعر میں اقبال نے قومی وحدت اور روحانی اجتماعیت کو ملت کی اصل طاقت قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک یہی قوت قوموں کو تاریخ کے نشیب و فراز میں زندہ، متحرک اور باوقار رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کا نظریۂ فن صرف جمالیاتی یا ادبی نظریہ نہیں، بلکہ ایک تہذیبی، روحانی اور اجتماعی تصور ہے، جس میں شاعری حیاتِ ابدی کے پیغام، خودی کی بیداری اور ملت کی تعمیر کا مؤثر ذریعہ بن جاتی ہے۔

اقبال نے اپنے مکتوبات اور نثری تحریروں میں بھی فن اور ادب کے بارے میں اپنے نظریات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک فن کوئی الگ تھلگ، بے مقصد یا محض تفریحی سرگرمی نہیں، بلکہ زندگی کی تعمیر و تشکیل میں شریک ایک فعال قوت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری، یا مصوری یا موسیقی، یا معماری، ان میں سے ہر ایک زندگی کا معاون اور خدمت گار ہے۔ اسی بنا پر آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح۔'' (اقبال، س ن، ص. ۵۹۵)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال فنونِ لطیفہ کو محض ذوقی تسکین یا جمالیاتی لطف کا ذریعہ نہیں سمجھتے، بلکہ انہیں انسانی زندگی کی تعمیر، ترقی اور ارتقا کے مؤثر وسائل قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کے نزدیک فن تخلیقی ایجاد، فکری بیداری اور تمدنی تعمیر کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

اقبال اس شاعری پر بھی تنقید کرتے ہیں جو زندگی کے حقیقی مسائل سے کٹ کر محض حسن پرستی، لفظی آرائش یا تفریحِ طبع تک محدود ہو جائے۔ ان کے نزدیک ایسی شاعری ''عجمیت'' کی علامت ہے، کیونکہ وہ انسان کو عمل، جدوجہد، مقصدیت اور خود آگہی سے دور کر دیتی ہے۔ اسی پس منظر میں وہ حافظ کی شاعرانہ سحر انگیزی کے مقابلے میں مولانا روم کی حیات بخش فکر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، کیونکہ رومی کی شاعری انسان کے اندر حرکت، یقین، خود شناسی اور عمل کی قوت پیدا کرتی ہے۔

اقبال کے نزدیک وہ شاعری جو معاشرے میں مثبت تبدیلی پیدا نہ کر سکے، زندگی کو نئی حرارت نہ دے اور انسان کے باطن میں عمل کی تحریک بیدار نہ کرے، اپنی حقیقی معنویت سے محروم رہتی ہے۔ اس تصور کی ترجمانی وہ ان اشعار میں کرتے ہیں:

افسردہ اگر اُس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہے تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

(اقبال، س ن، ص. ۵۹۵)

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک فن اور شاعری کا اصل معیار اس کی عملی تاثیر ہے۔ اگر کسی فن پارے میں زندگی کو متحرک کرنے، ظلم اور جمود کو چیلنج کرنے، اور انسان کو اعلیٰ مقاصد کی طرف مائل کرنے کی قوت موجود نہیں، تو وہ اپنی حقیقی فنی، اخلاقی اور تہذیبی ذمہ داری پوری نہیں کر سکتا۔

مختصراً، اقبال کے نظریۂ فن میں اعجازِ ہنر، حیات آفرینی، مقصدیت، خودی کی بیداری، وحدتِ ملت اور عمل کی ترغیب بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فن اور شاعری کا اعلیٰ ترین منصب یہ ہے کہ وہ فرد اور قوم دونوں کو حیاتِ نو عطا کریں، ان کے اندر یقین اور تخلیقی ولولہ پیدا کریں، اور انہیں مسلسل ارتقا، تعمیرِ ذات اور تعمیرِ انسانیت کی راہ پر گامزن رکھیں۔

کتابیات

اقبال، علامہ محمد۔ ۔کلیاتِ اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور،
اقبال، علامہ محمد۔ ۔کلیاتِ اقبال فارسی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور
شیخ محمد علی، نظریات و افکارِ اقبال نیشنل بک فائونڈیشن اسلام آباد
عبدالرحمٰن طارق، جہانِ اقبال، ادبی دنیا لاہور، جون ۱۹۳۴ء

گوپی چند نارنگ، اقبال کا فن، مضمون جگن ناتھ آزاد، ایجوکیشنل پبلیکیشنز ہائوس دہلی، اشاعت اول ۱۹۸۳ء۔

گوہر نوشاہی، مطالعہ اقبال، بزمِ اقبال لاہور ۱۹۸۳ء۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نقوشِ اقبال، سنہ اشاعت ندارد، مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی نمبر ۱۸

مولانا روم، مثنوی دفتر اول، ترجمہ اردو مولانا قاضی سجاد حسین صاحب، اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور۔